"ایک اہم اقتصادی مسئلہ اور اس کا حل"

مولانا محمد طاسین کے موقف پر ایک نظر

حافظ عاطف وحید

ماہ جون ۹۶ء کے حکمت قرآن میں "ایک اہم اقتصادی مسئلہ اور اس کا حل" کے عنوان سے قاری محمد عمر صاحب کا ایک سوال اور اس پر مولانا محمد طاسین صاحب کا جواب شائع ہوا ہے۔ مولانا موصوف نے معاملہ قرض کے ضمن میں کرنسی کی قدر کے مسلسل گرنے سے قرض خواہ پر پڑنے والے بوجھ کے مسئلے کا حل پیش کیا ہے۔ مولانا کے علمی مقام اور مرتبے کے پیش نظر ان کی کسی رائے پر رائے دینا' گو مجھ جیسے کم فہم کے لئے مناسب تو نہیں' تاہم مسئلہ زیر بحث میں چند نکات ایسے ہیں جن کی مزید تشریح اور تفہیم کی ضرورت ہے۔ ذیل میں ان امور پر اختصار کے ساتھ نکتہ وار بحث کی گئی ہے۔

مولانا صفحہ ۱۸ پر رقمطراز ہیں :

"کرنسی نوٹوں میں مثل کا مطلب ہے قوت خرید میں برابری جو مذکورہ صورت میں نہیں ہو سکتی کیونکہ آج کے کرنسی نوٹ قوت خرید میں ان نوٹوں کی قوت خرید کے برابر نہیں ہو سکتے جو مثلاً پانچ سال پہلے قرض کے طور پر لئے دیئے گئے۔ لہٰذا کرنسی نوٹوں کے قرض میں یہ ضروری ٹھہرایا جائے کہ جتنی تعداد میں وہ قرض لئے گئے ہوں ٹھیک اتنی ہی تعداد میں بوقت ادائیگی وہ واپس کئے جائیں تو اس صورت میں قرض دینے والے فریق کو نقصان پہنچتا اور اس کی لازماً حق تلفی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس وجہ سے بھی معاملہ مذکور ظلم اور حق تلفی کی بنا پر باطل اور ناجائز قرار پاتا ہے"۔

ربا کے معاملے میں ظلم اور حق تلفی کے اعتبار سے سورۃ البقرہ کی آیات ۲۷۹-۲۷۸ اہم ترین ہیں۔ ان آیات کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے :

"اے اہل ایمان' اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور ربا میں سے جو کچھ تا حال باقی ہے اسے چھوڑ دو پھر اگر تم مومن ہو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول (ﷺ)

کی طرف سے اعلان جنگ سن لو۔ اور اگر تم توبہ کر لو (یعنی باز آ جاؤ) تو تمہارے واسطے تمہارے اصل زر (راس المال) ہیں' نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ دوسرے تم پر ظلم کریں"۔

معاملہ زیر بحث کے اعتبار سے آیت نمبر ۲۷۹ بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ مولانا کا یہ کہنا کہ ظلم سے اجتناب کا یہ تقاضا ہے کہ قرض خواہ کو اس کا مال اپنی اصل قدر اور مثل کے مطابق واپس ملنا چاہئے نہ کہ اصل مقدار کے مطابق' اس آیت کے حوالے سے محل نظر ہے۔ کم سے کم دو اسباب کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آیت مذکورہ سیاق و سباق کے اعتبار سے مولانا کی رائے سے متعارض ہے۔

پہلا سبب یہ ہے کہ "لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ" کا منشا در اصل اس غلط فہمی کو رفع کرنا ہے جو مقروض اور قرض خواہ کے مابین پیدا ہو سکتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ پہلے سے جاری سودی معاملہ قرض کو حکم شرعی کی بنا پر ختم کرتے وقت مقروض اس بات پر نزاع پیدا کر سکتا ہے کہ قرض کی اصل رقم یا اس سے زائد تو وہ بطور سود ادا کر چکا ہے لہٰذا اب وہ مزید کچھ بھی ادا کرنے کا پابند نہیں۔ اس کے برخلاف قرض خواہ اس بات پر آمادہ ہو ہی نہیں سکتا بلکہ وہ اس بات پر اصرار کر سکتا ہے کہ ٹھیک ہے آئندہ بے شک سودی معاملہ نہ کیا جائے لیکن پہلے سے جاری سودی معاملے کو تو تکمیل تک پہنچایا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے نزاعات پیدا بھی ہوئے۔ علامہ بدر الدین عینی نے عمدۃ القاری: شرح صحیح بخاری میں بنی ثقیف اور بنی مخزوم کے خاندانوں بالترتیب بنی عمرو بن عمیر اور بنی المغیر کے مابین اسی قسم کے ایک نزاع پر مشتمل اثر کو نقل کیا ہے۔ خیال رہے کہ مذکورہ بالا دو آیات کے نزول کے پس منظر میں یہی واقعہ ہے۔

اللہ عزوجل نے اس قضیئے کو اس طرح سے حل کر دیا کہ معاملہ قرض میں سے سود والی شرط کو فی الفور ختم کیا جائے گا۔ جو سود پہلے ادا کیا گیا اس کا حساب ختم ہوا.... "فَلَهٗ مَا سَلَفَ" (البقرہ : ۲۷۵) اور قرض خواہ کو اس کا اصل زر واپس لوٹایا جائے گا... "فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ" (البقرہ : ۲۷۹) تاکہ فریقین میں سے کسی پر ظلم نہ ہو یا کسی کی حق تلفی نہ ہو۔

آیت مذکورہ سے مولانا کی رائے کے متعارض ہونے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ قرض پر لئے گئے اور واپس کئے جانے والے مال یا کرنسی کا مکمل ہم قدر یا ہم مثل ہونا ممکن ہی نہیں۔ اس لئے کہ افراط زر کے علاوہ بہت سے دوسرے اسباب بھی ہیں جو کرنسی کی قدر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی طرح کئی قسم کے اخراجات ایسے بھی ہوتے ہیں جو قرض خواہ کو معاملہ قرض کی صورت میں اٹھانا پڑتے ہیں۔ مثلاً قرض کی واپسی کے لئے جتنے جتن قرض خواہ کو کرنے پڑتے ہیں ان سے ہر وہ شخص واقف ہے جسے اس کا کبھی تجربہ ہوا ہو۔ ان میں مقروض کو یاد دہانی کے خط پتر یا ٹیلی فون کے خرچے' مقروض کے پیچھے قرض کی وصولی کے لئے ایک یا متعدد چکر اور ٹیکسی رکشہ کا کرایہ وغیرہ' مقروض کے "عسر" کے پیش نظر قرض کی واپسی میں تاخیر (وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ) یا قرض کی رقم کے مکمل ڈوب جانے کا اندیشہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس سب کے لئے قیمتی وقت کا ضیاع اور اس پر مستزاد کوفت کا سامنا ہے۔ یہ ایسے ممکنہ یا واقعی خرچے ہیں جنہیں قرض خواہ کو بہرحال برداشت کرنا پڑتا ہے اور ان کے سبب سے دیئے گئے پیسے کی حقیقی قدر میں فرق پیدا ہونا لازمی ہے۔

مزید برآں کوئی ایسا index بنانا بھی ممکن نہیں ہے جو مختلف اشیاء کی قیمتوں میں تبدیلی اور اوپر مذکور متعدد cost factors کی اس طور سے اکٹھی پیائش کرے کہ کرنسی کی قدر میں تبدیلی کو exctly متعین کر سکے۔ لہٰذا ایسی بات' جو نظری یا عملی طور پر ناممکن ہو اسے بنیاد بنا کر کوئی لائحہ عمل طے کرنا مناسب نہیں۔

آیت مذکورہ کی عبارت میں ایک اور ظاہری شہادت بھی ہے جو مولانا کی رائے کے خلاف جاتی ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ ربا کی دو قسموں یعنی ربا النسیئہ اور ربا الفضل میں سے مقدم الذکر کا بیان قرآن مجید میں ہے اور موخر الذکر کا ذکر حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے۔ اسی طرح یہ کہ ربا النسیئہ اصلاً روپے پیسے کے قرض میں سود کا نام ہے جبکہ اجناس کے لین دین میں سود کو ربا الفضل کہا جاتا ہے۔ گویا کہ آیت مذکورہ میں اصلاً روپے پیسے کے قرض کے بارے میں ہدایت و رہنمائی دی گئی ہے۔ آیت کی رو سے قرض خواہ صرف راس المال کا حق دار ہے (.... فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ) اس سے

زیادہ کا نہیں۔ اگر تو کہیں عبارت "فَلَكُمْ مِثْلُ رُءُوْسِ اَمْوَالِكُمْ" یا "فَلَكُمْ قَدْرُ رُءُوْسِ اَمْوَالِكُمْ" کی طرح ہوتی تو اس بات کا امکان ہوتا جس کی رائے مولانا نے دی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ جبکہ اوپر یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ "لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ" سے بھی سیاق و سباق کے اعتبار سے اس بات کی صداقت ثابت نہیں ہوتی۔

ضمناً یہ عرض کیا جائے تو بے محل نہ ہو گا کہ مال حقیقی اور مال حکمی کی تفریق میں بھی ایک پہلو قابل توجہ ہے۔ کتب فقہ میں سونے چاندی کو مال حقیقی کی تعریف کے تحت لکھا جاتا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ دور نبوی ﷺ میں سونے چاندی سے جہاں زیب و زیبائش کے آلات بنائے جاتے تھے وہیں یہ درہم و دینار کی صورت میں بطور کرنسی سکہ رائج الوقت مستعمل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد احادیث سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ جب بھی کسی سودے میں دینار کے عوض کسی سونے کی شے مثلاً سونے کا برتن یا سونے کے زیورات کی خرید کا معاملہ ہوتا وہاں بیع و شراء کے عام قوانین جو کہ کرنسی (دینار) بمقابلہ کوئی عام جنس ہوتے ہیں لاگو نہیں ہوتے' جیسا کہ صحیح مسلم کی اس حدیث میں ہے :

"عن فضالة بن عبيد قال كنا مع رسول الله ﷺ يوم خيبر نبايع اليهود الوقية الذهب بالدينارين والثلاثة فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تبيعوا الذهب بالذهب الا وزنا بوزن"

"حضرت فضالہؓ بن عبید فرماتے ہیں کہ ہم خیبر کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور یہود سے سونے کے بنے ہوئے برتن کا دو تین دینار کے عوض سودا کر رہے تھے۔ اس پر رسول اللہ نے فرمایا کہ سونے کو سونے کے عوض مت خریدو بیچو مگر برابر وزن میں"۔

مزید برآں اس دور میں درہم و دینار کی بطور کرنسی وہی حیثیت تھی جو آج کرنسی نوٹ کی ہے۔ ان سے اشیاء کے لین دین' اشیاء کی قدر کی پیائش اور قدر کے تحفظ کی اسی طریقے سے حاجت پوری کی جاتی تھی جس طرح روپے پیسے سے آج کی جاتی ہے۔ درہم و

دینار کا full bodied coin کی حیثیت سے آج کی token money تک کا سفر خاصا طویل بھی ہے اور تدریجی بھی۔ ابتداءً بڑھتی ہوئی تمدنی اور معاشی ضروریات کے پیش نظر یہ صرف وزن میں ہلکے کئے گئے' بعد ازاں دوسری دھاتوں کے ساتھ سونے کی ملاوٹ سے سکے بنائے جانے لگے' بالآخر رفتہ رفتہ ضرورت اور سہولت نے کرنسی کی وہ شکل پیدا کر دی جو آج کاغذی نوٹوں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر electornic money کی صورت میں پوری دنیا میں رائج ہے اور اسی طرح سے قبولیت عامہ رکھتی ہے جس طرح پہلے دور میں درہم و دینار مقبول تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر اس دور میں اشیاء کی قیمتیں گرتی یا چڑھتی ہیں تو درہم و دینار کے دور میں بھی ایسا ہوتا تھا' بعض احادیث سے اس بات کا سراغ ملتا ہے' اگرچہ وہ اتار چڑھاؤ آج کے دور کی نسبت کم ہوتا تھا۔ گویا کہ فرق صرف درجہ کا ہے۔ اور یہ درجہ کا فرق ان ممالک کے اعتبار سے اور کم ہو جاتا ہے جنکی کرنسی کی قدر نسبتاً مستحکم ہے اور انفلیشن ریٹ کم ہے۔ لہٰذا صرف درجے کے فرق کو بنیاد بنا کر درہم و دینار اور آج کی کرنسی نوٹوں میں نوعیت کا فرق پیدا کر دینا عدل نہیں۔

مولانا موصوف نے معاملہ قرض میں انفلیشن کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسئلے کا حل یہ تجویز کیا ہے کہ

> "جس وقت جو کرنسی نوٹ قرض لئے دیئے گئے اس وقت اس کے عوض بازار میں کتنی مقدار میں سونا مل سکتا تھا' پھر ادائیگی جب بھی ہو سونے کی اس مقدار کے برابر ہو' یعنی ادائیگی کے وقت سونے کی اس مقدار کی قیمت اگر قرض پر دیئے ہوئے نوٹوں کے برابر ہو تو مقروض اتنے ہی نوٹ ادا کرے جتنے اس نے لئے تھے۔ اور اگر سونے کی اس مقدار کی قیمت بڑھ جائے مثلاً ایک ہزار کے بجائے اب اس کی قیمت گیارہ سو روپے ہو گئی ہو تو مقروض پر لازم ہو گا کہ وہ ایک ہزار کے بجائے گیارہ سو کے نوٹ ادا کرے تاکہ قرض خواہ کو اس کا حق پورا پورا ملے اور معاملہ عدل کے مطابق طے پائے"۔

مولانا کی یہ رائے دو اعتبارات سے شریعت کے منشا کے خلاف ہے۔ اولاً یہ کہ عقد

قرض میں ایک لازمی امر یہ ہے کہ لی اور دی جانے والی شے عمومی نوعیت کے اعتبار سے یکساں ہوتی ہے۔ یعنی اگر روپیہ دیا گیا ہے تو روپیہ ہی واپس کیا جائے گا اور اگر کوئی جنس مثلاً گندم دی گئی ہے تو واپس بھی گندم ہی کی جائے گی۔ متعدد احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر باہم تبادلہ ایک جنس کی اشیاء کا کیا جائے تو وہ صرف برابری کی بنیاد پر ہی کیا جا سکتا ہے۔ یعنی اگر تبادلہ تول کر کیا جا رہا ہے تو اشیاء وزن میں برابر ہوں اور اگر گن کر کیا جا رہا ہے تو گنتی میں برابر ہوں۔ اسی طرح وہ "مثل" میں بھی برابر ہونی چاہئیں۔ یعنی اگر ۱۱۵ امریکی ڈالر لئے گئے ہیں تو واپس بھی امریکی ڈالر ہی کئے جائیں' آسٹریلوی یا کینیڈا کے نہیں۔ ناپ تول میں اگر برطانوی اونس یا گرام کا حساب رکھا گیا ہے تو واپسی بھی اسی پیمانہ سے کی جائے گی نہ کہ کسی دوسرے معیار کے پیمانے سے۔ پس ثابت ہوا کہ قرض خواہ اگر بطور قرض پاکستانی روپیہ دیتا ہے تو وہ واپس اتنا ہی پاکستانی روپیہ لے سکتا ہے جتنا اس نے گن کر دیا تھا' اس سے کم یا زائد نہیں۔ خواہ دیگر اشیاء کی قیمتیں کتنی ہی تبدیل نہ ہو گئی ہوں۔

ثانیاً مولانا کے تجویز کردہ طریقے سے معاملہ میں غرر فی الثمن پیدا ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ مدت قرض گزار مثلاً سال کے بعد سونے کی روپے پیسے میں قیمت معلوم کرنا آج ممکن نہیں۔ لہٰذا یہ غرر بالآخر تنازع پر منتج ہو سکتا ہے جو کہ شریعت کے منشاء کے صریحاً خلاف ہے۔ اسی طرح کے معاملے میں اصل حل وہی ہے جس کی نشاندہی مشکوۃ المصابیح میں باب الربا کی حدیث نمبر ۸ میں کی گئی ہے۔ اس حدیث کے مطابق حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے بازار میں اچھی قسم کی ایک صاع کھجور کا سودا گھٹیا قسم کی دو صاع کھجور سے کر لیا۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے اس معاملے کو ربوی معاملہ قرار دیا اور ساتھ ہی درست طریقے کی جانب بھی راہنمائی فرما دی کہ اگر ایسا کرنا مقصود ہو تو پہلے ایک قسم کی کھجور کو بازار میں فروخت کیا جائے' پھر اس سے حاصل ہونے والی رقم سے دوسری قسم کی کھجور خرید کی جائے۔ ظاہر ہے جب براہ راست دو مختلف معیارات کی کھجوروں کا باہم تبادلہ کیا جا رہا تھا تب بھی کسی بازاری قیمت کے اعتبار سے ہی ان کا تناسب تبادلہ مقرر کیا گیا ہو گا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ چونکہ تبادلہ یکساں نوعیت کی اشیاء کا تھا لہٰذا ان میں مقدار کا تفاوت

ربا قرار پایا۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ اگر کسی شخص کو دوسرے شخص کے ساتھ معاملہ قرض کرنا ہو تو بجائے اس کے کہ کرنسی نوٹوں کو کسی مال حقیقی کا اعتبار کر کے دیا جائے' درست طریقہ یہ ہے کہ قرض کسی مال حقیقی مثلاً سونا چاندی وغیرہ کی صورت میں لیا دیا جائے تا کہ کسی قسم کی شرعی قباحت آڑے نہ آئے۔

مولانا موصوف نے اپنی تحریر کے آخر میں لکھا ہے :

"افراط زر کے حوالے سے جو باتیں پڑھنے سننے میں آئی ہیں ان میں سے ایک نہایت غلط اور گمراہ کن بات یہ ہے کہ چونکہ اس سے کرنسی نوٹوں کی قوت خرید میں کمی واقع ہوتی ہے لہٰذا کرنسی نوٹوں کی شکل میں بینک کو دیئے گئے سودی قرضہ پر بینک سے سود لینا جائز ہے۔ گویا یہ بات کہنے والے کے نزدیک اس کمی کا ذمہ دار بینک ہے اور یہ کہ اگر وہ نوٹ بینک کو دینے کی بجائے کھاتہ دار کے پاس ہوتے تو ان میں کمی واقع نہ ہوتی۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے' کیونکہ وہ کمی تو ہر صورت میں واقع ہو کے رہتی ہے' کوئی اس سے بچ نہیں سکتا"۔

اس عبارت میں لفظ "گویا" کے بعد جو نتیجہ نکالا گیا وہ ناقابل فہم ہے۔ اگر بینک روپے کی قیمت میں کمی کا ذمہ دار نہیں ہے اور اس لئے سودی قرضہ پر بینک سے سود لینا جائز نہیں ہے تو کیا ایک عام آدمی جو کہ مقروض ہے وہ اس کمی کا ذمہ دار ہے؟ اگر اس سے قرض کی اصل زر سے زائد واپسی کسی مال حقیقی پر اعتبار کے نتیجے میں لی جا سکتی ہے تو اسی بنیاد پر بینک سے کیوں نہیں لی جا سکتی؟۔

عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال :

"اِنَّ آخِرَ مَا نَزَلَتْ آیَۃُ الرِّبَا وَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قُبِضَ وَلَمْ یُفَسِّرْھَا لَنَا' فَدَعُوا الرِّبَا وَالرِّیْبَۃَ"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' آپؓ نے فرمایا :

"آیتِ ربا آخر میں نازل ہونے والی آیت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتقال فرما گئے اور آپؐ نے ہمیں اس کی وضاحت نہ فرمائی۔ پس سود کو بھی چھوڑ دو اور سود کے شائبہ (والے ہر معاملے) کو بھی!"